# رسائل و مسائل

## سورۂ یوسفؑ کے متعلق چند سوالات

"سورۂ یوسفؑ کے مقامات سے متعلق آپ کے فہمِ قرآنی سے مستفیض ہونا چاہتا ہوں۔ قرآن کریم ہمیں بتاتا ہے کہ حضرت یوسفؑ کو تمکن فی الارض عطا فرمایا گیا اور وہ دائرۂ حکومت میں ایک ممتاز حیثیت سے شریک ہوگئے، لیکن ظاہر ہے کہ آپ ایک رسول تھے، اس لیے فریضۂ رسالت کی سرانجام دہی بھی آپ کے لیے ضروری تھی۔ دربارِ فرعون کے مردِ مومن نے اپنی تقریر میں اسکی طرف اشارہ بھی کیا ہے کہ حضرت یوسفؑ کی نبوت پر قومِ فرعون ایمان نہیں لائی تھی اور یہ بھی کہ آپ اپنی وفات تک ڈھیل دیتے رہے تھے۔ اس سے ظاہر ہوا کہ آپ نے اپنی نبوت کو پیش کیا لیکن فرعون اور اسکی قوم اس پر ایمان نہ لائی۔ اسکے باوجود حضرت یوسفؑ انکی حکومت میں شریکِ کار رہے۔ اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ خدا کا ایک برگزیدہ رسول ایک غیر خدائی نظامِ حکومت کا شریکِ کار کس طرح رہا، درآنحالیکہ وہ اس قوم کے سامنے اپنی نبوت بھی پیش کر چکا تھا اور اس قوم نے اسے تسلیم نہیں کیا تھا۔ ایسے منکرینِ دعوتِ اسلامی کے خلاف یا تو حضرت یوسفؑ کو جہاد کرنا چاہیے تھا یا برسبیلِ تنزل وہاں سے ہجرت لازم تھی۔ لیکن آپ نے نہ تو ہجرت ہی فرمائی اور نہ ہی ان کے خلاف جہاد کیا، بلکہ ان کے خلاف تبرّی اور بیزاری کا اعلان بھی کہیں دکھائی نہیں دیتا۔ کیا آپ اس گتھی کو سلجھائیں گے؟ دوسرا مسئلہ سجدۂ تعظیمی کا ہے۔ اس پر بھی روشنی ڈالیے"

بنی اسرائیل کی تاریخ کا وہ دور جو حضرت موسیٰ علیہ السلام سے پہلے گذرا ہے، قریب قریب بالکل تاریکی میں ہے، اس لیے قرآن کے اشارات کی تفصیل معلوم کرنا مشکل ہے۔ تاہم قرآن مجید نے اپنے مجمل

اشارات سے اس امر میں کوئی شک باقی نہیں رہنے دیا ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام کی حیثیت مصر میں غیر خدائی نظامِ حکومت کے "شریکِ کار" کی نہ تھی بلکہ وہی مختارِ کل تھے اور انہوں نے حکومت کی باگ ڈور اپنے ہاتھ میں لی ہی اس شرط کے ساتھ تھی کہ کُل اختیارات انکے ہاتھ میں ہوں۔ اس آیت کو بغور پڑھیے :-

قال اجعلنی علی خزائن الارض انی حفیظ علیم وکذلک مکنّا لیوسف فی الارض یتبوّأ منہا حیث یشآء

یوسف نے کہا مجھے ملک کے خزانوں پر حاکم بنا دے یقیناً میں حفاظت کرنیوالا اور واقف کار ہوں! اور اس طرح ہم نے یوسف کو اُس سرزمین میں اقتدار عطا کیا کہ اسمیں جس جگہ کو چاہے اپنی جگہ بنالے۔

خط کشیدہ فقرے صاف ظاہر کر رہے ہیں کہ مطالبہ کلّی اختیارات کا تھا اور ملے بھی کل اختیارات ہی "خزائن الارض" کا لفظ دیکھکر بعض لوگوں کو یہ غلط فہمی ہوئی ہے کہ یہ جگہ شاید فینانس ممبر یا ریونیو ممبر کی تھی حالانکہ دراصل اس سے مراد ملک کے جملہ وسائل (RESOURCES) ہیں۔ حضرت یوسف علیہ السلام کا مطالبہ یہ تھا کہ سلطنت مصر کے تمام وسائل میرے اختیار میں دیے جائیں، اور اسکے نتیجہ میں جو اختیارات انہیں ملے وہ ایسے تھے کہ پھر ساری سرزمینِ مصر اُنکی تھی۔ یتبوأ منہا حیث یشآء کو بھی لوگوں نے بہت محدود معنوں میں لیا ہے۔ انکے نزدیک اس کا مفہوم بس اتنا ہے کہ حضرت یوسفؑ ہر جگہ مکان بنا لینے یا قیام کرنے کے مجاز تھے۔ حالانکہ درحقیقت اس فقرے سے یہ تصور دلانا مقصود ہے کہ اس سرزمین پر حضرت یوسفؑ کا اقتدار ویسا ہی تھا جیسا ایک زمین کے مالک کو اپنی زمین پر حاصل ہوتا ہے۔

اب رہا یہ سوال کہ اس طرح حضرت یوسفؑ کو جو اقتدار حاصل ہوا اسکے ذریعہ سے انہوں نے ملک کے نظامِ تہذیب، تمدن و اخلاق و سیاست کو اصولِ اسلام کے مطابق تبدیل کرنیکی کیا کوشش کی؟ اور اس میں کس قدر کامیابی ہوئی؟ تو اسکے متعلق کوئی تفصیل ہمیں تاریخ میں نہیں ملتی، البتہ سورۂ مائدہ کے ایک اشارہ سے اتنا ضرور معلوم ہوتا ہے کہ مصر میں حضرت یوسفؑ کا اقتدار محض ایک شخص کا عارضی اقتدار نہ تھا بلکہ آپکے بعد ایک مدت دراز تک آپ ہی کے جانشین، جو یقیناً مسلمان ہی تھے، مصر پر حکمراں رہے، اور انہیں

وہ عظمت و شوکت حاصل ہوئی جو اس دور میں دنیا کی کسی قوم کو حاصل نہ تھی۔ آیت کے الفاظ یہ ہیں:

واذ قال موسیٰ لقومہ یٰقوم اذکروا نعمۃ اللہ علیکم اذ جعل فیکم انبیآء وجعلکم ملوکًا وّاٰتٰکم مالم یؤت احدًا من العٰلمین

یاد کرو جب موسیٰ نے اپنی قوم سے کہا تھا کہ اے میری قوم کے لوگو! اپنے اوپر اللہ کے اس احسان کو یاد کرو کہ اس نے تم میں انبیاء پیدا کیے اور تم کو فرمانروا بنایا اور تمہیں وہ کچھ دیا جو دنیا میں کسی کو نہ دیا تھا۔

اس سے قیاس کیا جا سکتا ہے کہ اس اسلامی غلبہ و تسلط کا لازمی اثر ملک کی پوری زندگی پر مترتب ہوا ہوگا۔

سورۂ مومن کی جس آیت سے آپ نے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ قبطی قوم نے حضرت یوسف علیہ السلام کو ماننے سے انکار کر دیا تھا، دراصل اس سے یہ نتیجہ نہیں نکلتا۔ میں ایسا سمجھتا ہوں کہ وہاں ہندوستان کی سی صورت پیش آئی تھی کہ ملک کی آبادی کے ایک معتدبہ حصہ نے اسلام قبول کیا اور بڑی اکثریت اپنے شرک پر قائم رہی، پھر جس حصہ نے اسلام قبول کیا وہی ایک مدت تک برسرِ اقتدار رہا، مگر رفتہ رفتہ اخلاقی و اعتقادی انحطاط نے اسکو غلامی اور گمراہی کی پستیوں میں گرا دیا حتیٰ کہ غلو اور اشخاص پرستی کے فتنہ میں پڑ کر عملاً اس میں اور دوسرے مشرکین میں کوئی خاص فرق باقی نہ رہا۔ اسی چیز کی طرف مومنِ آلِ فرعون نے اشارہ کیا ہے:۔

ولقد جاءکم یوسف من قبل بالبیّنٰت فما زلتم فی شکٍّ ممّا جاءکم بہ حتّٰی اذا ہلک قلتم لن یبعث اللہ من بعدہٖ رسولًا

اس سے پہلے یوسف تم لوگوں کے پاس صریح نشانیاں لیکر آئے تھے، مگر تم اُس چیز کے بارے میں برابر شک کرتے رہے جسے لائے تھے، پھر جب انکا انتقال ہوگیا تو تم نے کہا کہ اب انکے بعد اللہ کسی رسول کو ہرگز نہ بھیجے گا

خط کشیدہ دو فقروں میں سے پہلا فقرہ بتاتا ہے کہ حضرت یوسفؑ کی زندگی میں ملک کی

بیشتر آبادی آپکی نبوت کے متعلق شک میں رہی جیسا کہ اکثر انبیاء کے ساتھ ہوا ہے۔ اور دوسرے فقرہ سے معلوم ہوتا ہے کہ آنحضرت کے بعد جو لوگ آپکے معتقد ہوئے وہ آپکی شخصیت کے گرویدہ ہو کر غلو میں مبتلا ہو گئے اور کہنے لگے کہ اب کوئی رسول نہیں آسکتا اور اسی بنا پر انہوں نے بعد کے آنیوالے کو ماننے سے انکار کر دیا، جیسا کہ آگے چل کر یہودیوں اور عیسائیوں نے کیا۔ درانحالیکہ حضرت یوسفؑ یا حضرت موسیٰؑ یا حضرت عیسیٰؑ میں سے کسی کے بعد بھی اللہ کی طرف سے ختم نبوت کا اعلان نہ ہوا تھا۔

بہرحال اس آیت سے یہ معنی نہیں نکالے جا سکتے کہ حضرت یوسف علیہ السلام پر ملک میں کوئی بھی ایمان نہیں لایا تھا، بلکہ دوسرے اشارات کی مدد سے قیاس یہی ہوتا ہے کہ ملک میں اہلِ ایمان کا ایک گروہ پیدا ہو گیا تھا جس نے بنی اسرائیل کے ساتھ مل کر ایک مدت تک اسلامی نظامِ حکومت کو قائم رکھا اور وہ بعد میں بتدریج مائل انحطاط (DEGENERATE) ہوتا چلا گیا۔

حضرت یوسفؑ کو انکے والدین اور بھائیوں نے جو سجدہ کیا تھا اُس کی حقیقت جو میں تحقیق کر سکا ہوں، یہ ہے کہ قرآن مجید کے اس مقام پر "سجدہ" کا لفظ اُس معنی میں استعمال نہیں ہوا ہے جو اسلامی اصطلاح کے ساتھ مخصوص ہے، یعنی زمین پر ہاتھ گھٹنے اور پیشانی ٹکانا۔ یہ اصطلاحی سجدہ تو فی الحقیقت سجدہ کی وہ مکمل صورت ہے جسے عبادتِ الٰہی کے لیے مختص کیا گیا ہے، ورنہ لغت میں اس کے معنی محض عاجزی اور نیازمندی کے ہیں جس کا اظہار کسی فعل یا حالت سے ہو سکتا ہے۔ بنی اسرائیل کے ہاں یہ چیز آدابِ تہذیب میں داخل تھی کہ کسی کے احسان کا شکریہ ادا کرنے کے لیے یا کسی کے سامنے احترام کا اظہار کرنے کے لیے اس کے آگے کھڑے ہو کر سر خم کرتے تھے اور اسے ان کی زبان میں لفظ سجود سے تعبیر کیا جاتا تھا۔ چنانچہ توراۃ کے عربی ترجمہ میں لکھا ہے کہ قوم لوط پر عذاب نازل کرنے والے فرشتے جب حضرت ابراہیمؑ کے پاس انسانی صورت میں پہنچے تو حضرت ابراہیمؑ انکے استقبال کے لیے نکلے اور زمین کی طرف جھکے (فلما نظر رکض لاستقبالھم من باب الخیمۃ

وسجد الی الارض )۔ اسی طرح جب حضرت سارہ کا انتقال ہوا اور بنی حیت نے انکی قبر کے لیے زمین بلا معاوضہ پیش کی تو یہاں بھی حضرت ابراہیمؑ نے اُس قوم کے لیے اعترافِ احسان میں "سجدہ" کیا (فقام ابراھیم وسجد لشعب الارض لبنی حیت۔ اور فسجد ابراھیم امام شعب الارض) یہ وہی چیز ہے جسے انگریزی میں Bow کرنا کہتے ہیں اور جو آج تک یورپ میں داخلِ آداب ہے۔ حضرت یوسف علیہ السلام نے اپنے بھائیوں کے ظلم کے جواب میں جس عفو اور فضل اور احسان کا سلوک کیا تھا اور کنعان کی بدوی زندگی کے بجائے مصر میں شان اور عزت کے جس مقام پر انہیں پہنچایا تھا اسکے اعتراف و شکریہ میں انکے بھائیوں اور ان کے والدین نے اپنے ہاں کی تہذیب کے مطابق سرخم کیا اور یہی وہ بے اختیارانہ جھکاؤ تھا جسے قرآن نے "خرّوا لہ سجّداً" کے الفاظ سے تعبیر کیا ہے۔

---

## رشوت وخیانت کے متعلق چند مزید مسائل

"رشوت وخیانت کے متعلق ترجمان القرآن کے ایک گذشتہ پرچہ میں رسائل و مسائل کے زیرِ عنوان آپ نے جن مسائل پر بحث کی ہے انہیں کے متعلق چند مزید سوالات مجھے درپیش ہیں۔ امید ہے کہ آپ ان کے مدلّل جوابات سے میرے اور میرے بعض رفقا کے شبہات کو دُور فرما دینگے۔ سوالات حسب ذیل ہیں:۔

۱۔ ایسے افسروں کو ٹی پارٹیاں دینا بھی کیا رشوت میں شمار ہوگا جن کو حکومت کسی ایک فرد یا جماعت کے کام کی جانچ پڑتال کے لیے وقتی طور پر مقرر کرتی ہے؟ یہ لوگ تو غالباً اصطلاحی افسر کی حیثیت نہیں رکھتے، پھر ان کی خاطر مدارات میں کیا حرج ہے؟

۲۔ ایک گروہِ کثیر کا خیال ہے کہ گورنمنٹ کا مال، بالخصوص وہ مال جو پبلک کے مفاد پر صرف نہیں ہوتا بلکہ اسے گورنمنٹ اپنے مفاد اور تحفظ پر صرف کرتی ہے، جس صورت میں بھی لیا جا سکے، لے لینا

جائز ہے۔ یعنی خیانتاً یا بذریعہ رشوت وغیرہ۔ اس پر دلیل یہ لائی جاتی ہے کہ سود جس کا لینا دینا قطعی حرام ہے، اعاظم علما کے فتووں کے مطابق سرکاری بنک سے وصول کر لینا نہ صرف جائز بلکہ ضروری ہے۔ کیونکہ اگر اسے بنک میں چھوڑا جائے تو عیسائی مشنریوں کی وساطت سے وہ خود اسلام کے خلاف استعمال ہوگا۔ پھر فرمائیے کہ وہ مال جو کسی غلط نظامِ حکومت کے استحکام میں صرف ہوتا ہے اور جس کے متعلق یہ بھی ظاہر ہے کہ گورنمنٹ کا اپنا نہیں ہے بلکہ رعایا ہی سے بطورِ غصب لیا گیا ہے، کیوں نہ اسے ہر ذریعہ سے واپس حاصل کیا جائے؟"

آپ نے جو سوالات کئے ہیں ان کا جواب دینے سے پہلے اصولی طور پر یہ بات ذہن نشین کر دینا ضروری سمجھتا ہوں کہ ہم جو حلال و حرام اور جائز و ناجائز کی تمیز پر زور دیتے ہیں اور لوگوں کو اپنی اخلاقی ذمہ داریاں سمجھنے اور انہیں ملحوظ رکھنے کی تاکید کرتے ہیں، اس سے ہماری غرض ہرگز یہ نہیں ہے کہ موجودہ نظامِ باطل کو ایک ایسی پرہیزگار رعایا فراہم کر کے دیں جو ان کے لیے کم سے کم حد تک وجہ پریشانی ہو۔ درحقیقت اس نظامِ باطل کے طبعی اور لازمی ثمرات یہی ہیں کہ لوگ اخلاقی ذمہ داریوں سے بے پروا اور اپنی خواہشات و ضروریات کو پورا کرنے میں قانون کی گرفت کے سوا ہر دوسری قید سے آزاد ہوں۔ ملازموں کا رشوت خوار اور خائن ہونا اور رعیت کا وسیع معنوں میں چور ہونا اس نظام کا لازمی نتیجہ ہے۔ اس نظام نے انہیں صفات کی تخم ریزی کی ہے اور یہ نظام اس کا مستحق ہے کہ اس کے لیے یہی ثمرات اسکی تخم ریزی کے نتیجہ میں پیدا ہوں۔ ظاہر ہے کہ خائنوں، چوروں اور بداخلاق لوگوں کی قیادت میں پاکیزہ اخلاق رکھنے والے لوگ تو پرورش نہیں پا سکتے۔ پس اخلاق کی گفتگو سے ہماری غرض یہ ہرگز نہیں ہے کہ ان بدسیرت اور بدکردار کارفرماؤں کو انکی کشت خبیث کے زہریلے ثمرات سے بچائیں اور صالح ثمرات ان کے لیے فراہم کریں۔ مگر ہمیں جو کچھ فکر ہے وہ دراصل خود اپنے اخلاق اور اپنی سیرت و کردار کی ہے۔ ہم چاہتے ہیں کہ اس نظام کے بُرے اثرات سے اپنے بھائیوں

کی زیادہ سے زیادہ تعداد کو بچائیں اور ان کے اندر اُن اعلیٰ درجہ کے اخلاق کو نشو و نما دیں جن کی بدولت وہ خدا تعالیٰ کی نگاہ میں موجودہ بدعمل کارکنوں اور کارفرماؤں کی بہ نسبت صالح تر ٹھیریں اور اللہ تعالیٰ دنیا کی قیادت کے لیے اُن کی بہ نسبت اِن کو اہل تر قرار دے۔ اس غرض کے لیے ہم اُن بُرائیوں سے بھی لوگوں کو بچنے کا مشورہ دیتے ہیں جن کا ارتکاب اگرچہ موجودہ نظام کے مقابلہ میں کوئی بُرائی نہیں ہے بلکہ شاید بھلائی کی تعریف میں آسکتا ہے، مگر وہ بجائے خود اخلاق اور شریعت کی نگاہ میں مذموم ہیں۔ اب میں سلسلہ وار آپ کے سوالات کے جوابات عرض کرتا ہوں:۔

۱۔ جہاں تک میں سمجھتا ہوں، خواہ اپنے مستقل افسر ہوں یا کسی دوسرے محکمہ کے لوگ ہوں جنہیں جانچ پڑتال وغیرہ کے لیے مقرر کیا جاتا ہے، اُن کے ساتھ مخلصانہ محبت اور شخصی عقیدت وگرویدگی کا تعلق شاید ایک فی ہزار حالات میں بھی نہیں ہوتا اور اگر ان سے مفاد وابستہ نہ ہوں تو غالباً کوئی شخص ان کی خاطر و مدارات کا خیال بھی نہیں کر سکتا۔ یہ دعوتیں اور ٹی پارٹیاں سب اسی غرض سے ہوتی ہیں کہ ان کے ذریعہ سے کوئی فائدہ، کوئی رعایت یا کم از کم چشم پوشی حاصل کی جائے۔ اس لیے فی الحقیقت یہ بھی اُسی طرح رشوت کی تعریف میں آتی ہیں جس طرح عام اور معروف رشوت۔ لیکن جیسا کہ میں نے اوپر اپنی اصولی توضیح میں بیان کیا ہے اس کے خلاف ہمیں جو کچھ بھی اعتراض ہے، اس بنیاد پر ہے کہ ایسی پارٹیوں کے دینے اور قبول کرنے سے ہمارے اپنے بھائیوں میں ناجائز ذرائع سے کام نکالنے اور لوگوں سے ناجائز فائدے اٹھانے کی بیماری پرورش پاتی ہے۔ ورنہ یہ سارا نظام تو حرام سے بنتا، حرام کھاتا اور حرام ہی اُگلتا ہے۔

۲۔ اس سوال کو جس طریقہ سے آپ نے پیش کیا ہے اس میں بنیادی غلطی یہ ہے کہ آپ یا جن لوگوں کا نقطۂ نظر یہ ہے، صرف اس پہلو کو مدِ نظر رکھتے ہیں کہ ایک فریق کے پاس مال

کس نوعیت کا ہے، مگر اس پہلو کو پیشِ نظر نہیں رکھتے کہ دوسرا فریق اس کو حاصل کس حق کی بنا پر کر رہا ہے۔ فرض کیجیے کہ ایک شخص کے متعلق مجھے معلوم ہے کہ وہ چور ہے اور اسکے پاس سارا مال چوری کا ہے۔ پھر کیا اسکے معنی یہ ہیں کہ میرے لیے اسکے ہاں چوری کرنا یا اسکی جیب کتر لینا جائز ہے؟ اس میں شک نہیں کہ اگر متعین طور پر مجھے معلوم ہو کہ اسکے قبضہ میں فلاں مخصوص چیز میرے مملوکہ مال سے چرائی ہوئی ہے اور پھر میں کسی وقت اسے حاصل کر لینے پر اپنے آپ کو قادر پاؤں تو میرے لیے اس کا حاصل کر لینا جائز ہوگا۔ لیکن یہ عام مفروضہ صحیح نہیں ہے کہ چور کے مقبوضہ مال کو چرا لینا بہر حال ہر شخص کے لیے حلال ہے۔

سود کی جو مثال آپ نے دی ہے وہ یہاں اس لیے منطبق نہیں ہوتی کہ سود ہم بلینکر سے چھینتے یا چراتے نہیں ہیں بلکہ وہ خود اپنے قاعدہ کے مطابق اسے نکالتا ہے اور ہم اس لیے مجبوراً اسے لے لیتے ہیں کہ اسے چھوڑنا ڈاکو کے اسلحہ خانہ میں چند اور تلواروں کا چھوڑنا ہے تاکہ وہ ان سے مظلوموں کو ذبح کرنے میں اور زیادہ مدد لے۔ پھر اس سود کو بھی وصول کر کے خود اپنے استعمال میں لانا حلال نہیں ہے، بلکہ اسے نادار طبقوں میں تقسیم کر دینا چاہیے، اس لیے کہ یہ سارا سود دراصل اُن غریبوں ہی کی جیب سے آتا ہے جو کسی دوسرے پر اس بلا کو پھینک دینے کی قدرت نہیں رکھتے۔

یہاں پھر یہ سمجھ لیجیے کہ ہم حکومت کے اموال پر دست درازی کی مخالفت اس لیے نہیں کرتے کہ یہ حکومت کسی ایماندارانہ برتاؤ کی مستحق ہے، بلکہ صرف اس لیے کرتے ہیں کہ خود ہمارے اندر استحقاق کے بغیر فائدہ اُٹھانے کی بیماری پرورش نہ پائے۔

---